مذہب، گروہی تعلقات
اور
تنازعۂ کشمیر

یوگندر سکند

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

مشعل

MashalBooks.org

مذہب، گروہی تعلقات

اور

تنازعۂ کشمیر

جوگندر سکند

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

مشعل بکس

آر بی۔ ۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور۔ ۵۴۶۰۰ پاکستان

MashalBooks.org

2

مذہب، گروہی تعلقات
اور
تنازعۂ کشمیر

یوگندر سکند
اردو ترجمہ: محمد یحییٰ خان

کاپی رائٹ اردو (c)2011 مشعل بکس

ناشر: مشعل بکس
آر۔ بی۔ ۵۔ سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک،
نیوگارڈن ٹاؤن لاہور54600، پاکستان

فون وفیکس 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

ترتیب

1	پیش لفظ	5
2	قومیت، مذہب اور تنازعۂ کشمیر	18
3	خطرناک دشمن، اٹوٹ رشتے: یکساں مذہبی تعصّبات	27
4	کشمیر کی سیاست پر نئے سرے سے غور	34
5	کشمیر میں قیامِ امن: مذہب کے حوالے سے تخلیقی فکر	38
6	کشمیری صوفی ازم: قیام امن کے مذہبی ذرائع	43
7	کشمیر میں شریعت پر مبنی اسلام اور مکالمے کے امکانات	53
8	کشمیر میں زلزلہ، دہلی میں بم دھماکے اور ہمارا ردّعمل	63
9	دہلی کے بم دھماکے اور لشکر کا جہادی ایجنڈا	69
10	دنیا کے نام ”حمید“ کا پیغام: ایک کشمیری کی طرف سے ہوشمندی کی اپیل	74
11	کشمیر کے سب سے بڑے مدرسے میں	80
12	جماعت سٹائل اسلامی فلسفے کی مفلسی	84
13	ڈوڈہ میں بین المذاہب تعلقات	91
14	سیاست اور تبلیغی جماعت: ڈوڈہ کے مناظر	96
15	جماعت اسلامی کے اندر سے اٹھنے والی گوناگوں آوازیں	101
16	ایک مختلف ڈوڈہ	110
17	ایک دن ”گنڈوہ“ میں	116
18	کشتواڑ: مایوسی میں امید	123
19	ڈوڈہ کے یتیم: مسلسل کشمکش کے معصوم شکار	132
20	ڈوڈہ کی یتیم لڑکیوں کے لیے ریاست کیا کر رہی ہے؟	137

MashalBooks.org

21	کلہند: قتل عام کے ایک ماہ بعد	143
22	کلہند: قتل عام کے آٹھ ماہ بعد	148
23	ڈوڈہ میں ولیج ڈیفنس کمیٹیوں کا قیام	150
24	بے جے پی کی ''ڈوڈہ بچاؤ'' مہم	162
25	جموں میں دلت: شنوائی کا مطالبہ	172

MashalBooks.org

پیش لفظ

میری کشمیر دیکھنے کی پہلی یادیں بہت مدھم سی ہیں۔ وہ1970ء کی دہائی کے ابتدائی سال تھے۔ میں اس وقت سات برس کا تھا۔ ہم بچپن میں سردیوں کے ہرموسم کاایک مہینہ دہلی میں اپنے ددھیال میں گزارتے اور وہاں سے پندرہ سولہ دن کے لئے آگے ایک نئی جگہ، ایک پہاڑی مقام پر چلے جاتے جو پرندوں اور جنگلی جانوروں کے لئے ایک محفوظ علاقہ تھا۔ ہم آگرہ میں تاج محل، سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ، مدھیہ پردیش میں مندر اور قلعے یا راجپوتوں کے محلاّت دیکھتے اور صحرائے تھر میں دور افتادہ چھوٹے چھوٹے گاؤں دیکھنے بھی چلے جاتے۔

دسمبر1974ء میں ہم کشمیر گئے۔ جموں تک ٹرین میں سفر کیا اور پھر سری نگر تک کار میں گئے۔ مجھے اس سفر کے چند اکّا دکّا واقعات یاد آتے رہتے ہیں۔ مثلاً ادھم پور کی فوجی چھاؤنی میں ہم ایک کرنل کے ہاں ٹھہرے جس نے اپنے ڈرائنگ روم میں کُھمبیاں(mushroom) اگا رکھی تھیں۔ علاقے میں اونچی اونچی چوٹیاں تھیں جن سے نیچے پتھروں اور روڑوں سے اَٹے ہوئے ڈھلان تھے۔ اِن چوٹیوں نے وادئ کشمیر کو جموں سے اور نیچے واقع انڈین میدانوں سے الگ کر رکھا تھا۔ خوبصورتی سے تراشے ہوئے مغل باغ بھی بہت یاد آتے ہیں، ویری ناگ میں منجمد مچھلی تالاب تھا جہاں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سے دریائے جہلم نکلتا ہے۔ پام پور میں ایک نیم روشن ریستوران ہوا کرتا تھا جس میں بیٹھ کر ہم نے لنچ کیا اور گرما گرم ''رِجما'' اور چاول کھائے تھے۔

سری نگر میں ایک سٹور تھا جہاں سے ہم نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو دینے کے لئے تحفے اور خشک میووں کے کریٹ خریدے۔ پتلی پتلی کشتیاں ''شکارا'' جھیل ڈل کے پُرسکون پانیوں میں خاموشی تیر رہی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر وہ خوبصورت اور توانا وصحتمند

گوجر یاد آتے ہیں جن کی ناک شکرے کی طرح مڑی ہوئی ہوتی ہے۔ راستے میں اگر ہماری کار سڑک سے پھسل جاتی تو یہ لوگ خوش دلی سے اسے دوبارہ سڑک پر لانے میں ہماری مدد کرتے تھے۔ جب ہم چھٹیاں گزار کر واپس کلکتہ پہنچ گئے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے دل میں پھر وہیں جانے کی تمنا مچلنے لگی۔ میں اس نوعمری کے زمانے میں بھی اس صاف ستھرے اور بکھیڑوں سے پاک ماحول میں واپس جانے کے خواب دیکھتا رہتا۔ جہاں ہمالیہ کے پہاڑوں میں گم گاؤں بے شمار پہاڑی چراگاہوں سے گھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ وہیں جا کر بس جاؤں اور اون سے لدی بھیڑیں اور گھم گچھا بالوں والی بکریاں چراؤں اور اپنی سبزیاں اُگاؤں۔

میرا جموں و کشمیر کا دوسرا 'وزٹ' 1991ء میں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب بھارت سے ''آزادی'' حاصل کرنے کی تحریک نے ریاستی انتخابات میں زبردست دھاندلی کے باعث عسکری شکل اختیار کر لی تھی۔ ان انتخابات میں آزادی کی حامی جماعتوں کی کامیابی یقینی سمجھی جاتی تھی۔ بھارتی حکومت نے اس چیلنج کا جواب بڑے پیمانے پر تشدد اور انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزی سے دیا۔ جبر و تشدد کی ایک لہر چلی آ رہی تھی جس میں اس وقت تک ہزاروں افراد، زیادہ تر کشمیری مسلمان بھارتی فوج، مقامی اور ان گروپوں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے جن کے اڈے پاکستان میں تھے۔ ان گروپوں میں کچھ سیکولر تھے، بہت سے اسلام پسند تھے اور جرائم پیشہ افراد بھی ان میں شامل تھے۔ کشمیری پنڈتوں کو تقریباً اجتماعی طور پر اپنی آبائی سرزمین سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بارے میں رائے عامہ منقسم چلی آ رہی تھی اور آج بھی اسی طرح ہے کہ ان کی بڑے پیمانے پر نقل مکانی کا ذمہ دار کون تھا۔ پنڈتوں کا اپنا کہنا اور ان کے حوالے سے بھارتی حکومت اور میڈیا کا کہنا یہ تھا کہ اس کے ذمہ دار عسکریت پسند لوگ یا پاکستان ہے جبکہ بہت سے کشمیری مسلمانوں کو شک تھا کہ یہ سب ایک سازش کا نتیجہ ہے جس کا جال اُس وقت کے گورنر جموں و کشمیر جگموہن نے بُنا تھا تا کہ تحریک ''آزادی'' کو ''مسلمانوں کی گروہ بندی'' یا اسلامی بنیاد پرستی کا رنگ دے کر اس کے جواز کو بین الاقوامی برادری کی نظروں میں مشکوک بنایا جا سکے۔

اس وقت کشمیر کا سفر محفوظ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ میں اس خطے میں جانے کی مشکل سے ہی

جرأت کرسکتا تھا مگر ہوا یوں کہ ایک بار اتفاقاً دہلی میں میری ملاقات ایک ہندو راجپوت سے ہو گئی جو اندازاً میری عمر کا ہی ہو گا۔ وہ ضلع ڈوڈہ کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ پہاڑی ضلع جموں اور کشمیر کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ یہ راجپوت جلدی میرا دوست بن گیا (یہ دوستی اب تک برقرار ہے)۔1990ء کی گرمیوں میں جب ڈوڈہ میں حالات نسبتاً پُرسکون تھے۔ میں اپنے دوست کے گاؤں گیا جہاں میں نے ایک ہفتہ گزارا۔ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد تقریباً برابر برابر تھی اور میں نے محسوس کیا کہ گاؤں میں ان کے باہمی تعلقات بھارت کے بیشتر حصوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ خوشگوار اور خیر سگالی کے تھے۔ وہ اکثر ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے، ایک دوسرے کی دکان سے خریداری کر کے ان کی سرپرستی کرتے اور بہت سے لوگوں نے مشترکہ کاروبار بھی کر رکھے تھے۔

کوئی ایک سال سے بھی کم عرصہ ہوا ہو گا کہ یہی ڈوڈا، پیر پنجال پہاڑوں کے پار کی وادیٔ کشمیر کی طرح ایک حقیقی خطۂ جنگ میں تبدیل ہو گیا۔ میرے دوست کا اصرار تھا کہ میں گرمیاں اس کے پاس ہی گزاروں جس پر میں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ صورتِ حال کتنی تیزی سے خراب سے خراب تر ہو رہی ہے، اس کی پیشکش قبول کر لی۔ جموں سے اس کے گاؤں تک سفر عام حالات میں آٹھ گھنٹے کا تھا مگر یہ عسکریت پسندی شروع ہونے سے پہلے کی بات تھی، اب دگنا وقت لگنے لگا۔ بس کو ہر پانچ کلومیٹر پر فوجی ناکہ بندیوں پر ٹھہرنا پڑ رہا تھا۔ جہاں مسافروں کو اتر کر کرخت چہروں والے سپاہیوں کے سوالوں کے جواب دینا پڑتے۔

ان گرمیوں کا ایک مہینہ میں نے ڈودہ میں گزارا۔ دوست کے گھر کو اپنا اڈہ بنا کر میں ضلع بھر کے دیہات اور قصبوں میں گھومتا پھرتا رہا اور ضلعے سے باہر بھی چلا جاتا تھا۔ عسکریت پسندوں کا تشدد اور فوج کی جبری کاروائیاں اس وقت اپنے عروج پر تھیں۔ ہر دن رقوم بٹورنے، بم دھماکوں، قتل و غارت اور اغوا کی نئی خبریں لے کر آتا جو کشمیری، پاکستانی اور افغان عسکریت پسندوں کی کارگزاریاں تھیں۔ بھارتی فوج بھی اصلی یا نقلی مقابلوں میں گولیاں چلاتی رہتی تھی۔ پورے ضلعے میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی سخت کرفیو نافذ کر دیا جاتا جو سورج طلوع ہونے کے بعد بھی جاری رہتا۔ ساری آبادی کو مذہبی بنیادوں پر

ہندوؤں اور مسلمانوں میں بانٹنے کا عمل تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ جو لوگ صدیوں یکجا رہے اب وہ ایک دوسرے کو نفرت اور شک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اس وقت تک میرے دوست کا خاندان، خطّے کے بہت سے دوسرے ہندوؤں کی طرح دائیں بازو کے ہندوؤں کا پُر جوش حامی بن چکا تھا جبکہ خاندان کے بہت سے نوجوان راشٹر یا سیوک سنگھ (RSS) کے فعالیّت پسندوں کے ہمنوا ہو گئے تھے۔ وہ ہر صبح مقامی مندر کے باہر گھاس بھرے میدان میں روزانہ کے ''شاکھا'' کے لئے پہنچتے جو آر ایس ایس کی ایک مخصوص ورزش تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ گاتے تھے جو میرے خیال کے مطابق وحشیانہ اینٹی مسلم نظمیں تھیں مگر اُن کے خیال میں یہ ہندو مناجات تھیں۔ شاموں کو وُہ ایک مکان کے احاطے میں چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے۔ گاؤں کے دیگر ہندو نوجوان بھی آ جاتے، اور ان بھر کے واقعات پر اظہار خیال شروع ہو جاتا۔ ان واقعات میں عسکریت پسندوں کی تحریک، بم دھماکوں، اغوا اور قتل و غارت کی تازہ خبریں شامل ہوتیں۔ وہ یہ باتیں بھی کرتے کہ مقامی ہندوؤں کو ان لوگوں سے اپنے بچاؤ کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اگرچہ وہ مسلمان پڑوسیوں کے ساتھ ہی پلے بڑھے تھے مگر اب وہ غضبناک مسلم دشمن بن چکے تھے اور ان کا اتفاق رائے تھا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں پُر امن زندگی کبھی نہیں گزار سکتے۔ مسلمانوں سے نفرت ان سب کے دھرم کا بنیادی عنصر تھا۔ یہ بات بجائے خود ایک مذہب سے کمتر نہیں تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے دوست کے بعض رشتہ دار مجھے ایک بے جوڑ یا انوکھا آدمی پاتے، ان میں سے بعض میرے ارادوں کو مشکوک سمجھتے جبکہ چند ایک کا یہ خیال بھی تھا، جیسے کہ اس نے بعد میں بتایا، کہ میں کسی قسم کا جاسوس ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ میں عسکریت پسندوں کے بارے میں ان کے عدم تحفظ کے احساس کا ہمنوا تھا، (کیونکہ اُن کی بات اُس وقت ڈوڈا کے بڑے حصے میں ایک قانون کا درجہ سمجھی جاتی تھی) مگر میں نے واضح کر دیا تھا کہ میں ان کی مسلمانوں کے ساتھ دلی دشمنی پر مبنی خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ وہ میری ان باتوں کو غدّاری سے کم سمجھنے پر تیار نہیں تھے اور انہوں نے اپنے اس احساس کو مجھ پر اچھی طرح واضح کر دیا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نے چند مقامی مسلمان نوجوانوں

سے دوستی رکھی ہوئی ہے تو وہ اتنے برافروختہ ہو گئے کہ انہوں نے میرے دوست سے کہا کہ وہ مجھے گاؤں فوراً چھوڑ دینے کے لئے کہہ دے۔ یہاں مجھے اپنے دوست کے میرے ساتھ تعلقات نبھانے کے عزم کا لازماً اعتراف کرنا چاہئے۔ اس نے اپنے ناراض رشتے داروں سے واضح طور پر کر دیا کہ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ اپنی بات کو زیادہ قوت سے منوانے کے لئے اس نے یہاں تک کر دیا کہ میرے مسلمان دوستوں کو اپنے گھر میں کھانے کی دعوت دے دی۔ ایسے حالات میں جب ڈوڈہ کے طول وعرض میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے، یہ ایک ناقابل تصور بات تھی۔

جس طرح راشٹریہ سیوک سنگھیوں (آر ایس ایس) نے ڈوڈہ کے ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد کے اندر اپنی جڑیں گہری کر لی تھیں، مجھے اپنے پہلے وزٹ میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ دائیں بازو کے اسلامی گروپوں کو بھی ضلع میں کافی سپورٹ حاصل ہو چکی ہے۔ مقامی مسلمانوں کی ایک وافر تعداد اسلامی جنگجوؤں کے ساتھ مل گئی تھی اور ان میں سے بہت سے فوجی تربیت کے لئے سرحد پار کر کے پاکستان بھی چلے گئے تھے۔ ان میں سے بعض نے واپس آ کر ڈوڈہ میں بم دھماکے کرنا شروع کر دیئے، جن میں بیسیوں بے گناہ افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کے بھارتی مسلّح افواج سے مقابلے ہوئے جن میں ان میں سے خاصی تعداد ماری گئی۔ ان میں سے بعضوں نے لوٹ مار جنسی زیادتیوں اور ذاتی انتقام کے لئے بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں۔

خیال کیا جاتا تھا کہ وادیٔ کشمیر کی طرح ڈوڈہ کے مسلمانوں کی اکثریت بھی جنگجوؤں کے مطالبۂ آزادی کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہے۔ اگرچہ یہ بات واضح نہ تھی کہ کیا ان کی اکثریت پاکستان کے ساتھ الحاق کی حامی تھی یا خودمختار جموں وکشمیر کے حق میں تھی۔ البتہ یہ واضح تھا کہ مسلمان ہونے کے ناطے انہوں نے اپنی پسند کا پوری قوت کے ساتھ اظہار کر دیا ہے۔ وہ یا تو مسلم پاکستان کی حمایت میں تھے یا مسلم اکثریت کی خودمختار ریاستِ جموں وکشمیر کے حامی تھے اور ہندو انڈیا کے ساتھ الحاق کے شدید مخالف تھے لیکن اس میں وہ ڈوڈہ کے ہندوؤں سے مختلف نہیں تھے جن کی مذہبی وفاداریوں نے بھی ان کی سیاست کا تعیّن کر دیا تھا۔ وہ ہندو اکثریت کے حامل بھارت کے ساتھ جموں وکشمیر کے الحاق کے

MashalBooks.org

پُرجوش حامی تھے۔ مجھ پر یہ بات شروع ہی سے واضح تھی کہ تنازعۂ کشمیر کی اصل بنیاد عدم برداشت اور منافرت پر مبنی اختصاصی فہمِ مذہب و معاشرت پر استوا ہے۔

جیسے کہ ہندوؤں کا معاملہ ہے ڈوڈہ کے اس دورے (اور بعد کے دورے میں بھی) میں جن مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی ان کے سیاسی رویّوں کی تہہ میں مذہب پر مبنی ثقافتی میلانات اور سوچیں کارفرما پائی گئی ہیں۔ میں اہلِ حدیث (سعودی وہابیوں کے جنوب مشرقی مکتبۂ فکر کے حامی) فعالیّت پسندوں سے ملا جن کا اصرار تھا کہ ہندو ''غیر کشید کردہ جھوٹ'' (undistilled falsehood) کے پیروکار ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ وہ تمام مسلمانوں جو ان کے مکتبۂ فکر کی پیروی نہیں کرتے فی الحقیقت مرتد ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے پُرجوش وکیل تھے۔ میں نے تبلیغی جماعت کے کارکنوں سے بھی گپ شپ کی۔ یہ جماعت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی تحریک ہے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ غیر مسلم دائمی عذاب کے لئے دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ یہ موقف فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور کسی بھی صُلحِ کل تحریک کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ میں جماعت اسلامی کے جوشیلے لوگوں سے بھی ملا جو کہ جنوبی ایشیا میں اسلام کی ایک بلند پایہ پارٹی ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ اسلام ہر مسلمان پر زور دیتا ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے بھرپور جدوجہد کرے، اگر ضرورت پڑے تو وہ تشدد سے بھی کام لے سکتا ہے۔ انہوں نے پُرجوش انداز میں کہا کہ جمہوریت اور سیکولرازم اسلام کی رُو سے سخت ممنوعہ راستے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کشمیر کو بھارت کے کنٹرول سے آزاد کرایا جائے خواہ اس کے لئے جہاد کیوں نہ کرنا پڑے۔

ان کا دعویٰ ہے کہ جب تک کشمیر ایک ''کافر ریاست'' کی غلامی میں رہے گا کشمیری مسلمان مناسب انداز میں اور پوری دلجمعی سے اپنے ایمان کے مطابق عمل نہیں کرسکیں گے۔ میں اکثر خودساختہ اسلامی ریڈیو سٹیشن کو ''ٹیون'' کرتا جو سرحد پار، پاکستان کے زیرِانتظام کشمیر میں قائم ہے۔ اس سے ہونے والی معمول کی نشریات میں یہ خبریں دی جاتیں کہ ہندو کافر سپاہی ریاست کے بھارت کے زیرِقبضہ حصے میں مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ اس سے مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ مقامی مسلمانوں کے دلوں میں بھارتی

حکمرانی کے خلاف سخت مخاصمت کے جذبات پیدا کئے جا رہے ہیں جن کا اظہار ایک جاری متشددانہ بغاوت کی شکل میں ہو رہا ہے۔ اس صورتِ احوال کو انڈین سٹیٹ کے ہندوانہ مزاج کے بارے میں عام تاثر، اس کی ایجنسیوں کی ناقص کارکردگی اور ان حقیقی نااہلیوں نے مزید پیچیدہ بنا دیا جن کی وجہ سے بھارت کے کئی دوسرے حصوں کے مسلمانوں کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان میں وقتاً فوقتاً پھوٹنے والے تشدّد کے واقعات بھی شامل تھے جیسے کہ گجرات میں وسیع پیمانے پر نسل کشی کی گئی تھی۔ یہ مظالم ہندو بلوائیوں اور ریاستی حکام کے ساز باز کا نتیجہ تھے۔

میں 1990ء میں کئے ہوئے دورے کے بعد تقریباً ہر سال ڈوڈہ جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے میرے دوستوں کا حلقہ مسلسل بڑھتا آ رہا ہے۔ ان میں درجنوں ہندو اور مسلمان شامل ہیں۔ خطّے کے ان سالانہ دوروں کی وجہ سے میری ابتدائی پیش آ گاہی کے درست ہونے کے ٹھوس شواہد سامنے آ چکے ہیں اور وہ یہ کہ تنازعۂ کشمیر کا اصل سبب ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں منفی اور مغائرت پر مبنی سوچ ہے۔ میں غیر متزلزل طور پر اس امر کا قائل ہوں کہ اس بظاہر بے قابو اور پیچیدہ مسئلہ کشمیر کی جڑیں اقتصادی اور سیاسی دائرے میں کم اور مذہبی و ثقافتی شعبے میں زیادہ ہیں۔ خصوصاً اس بات میں ہیں کہ ہندو اور مسلم مذہبی اور معاشرتی شناختوں کے تصورات کی تمہید ہی ایک دوسرے سے سنگدلانہ عداوت پر رکھی گئی ہے۔ ہر بار جب میں ڈوڈہ جاتا تو مجھے ہندوؤں اور مسلمانوں سے میل ملاپ میں یہ بات تکلیف دِہ طور پر اپنی یاد دلاتی اور مجھے ہندو اور مسلم تحریکوں میں فعال کردار ادا کرنے والے اپنے دوستوں میں بھی دکھائی دیتی۔ مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ تنازع کی اصل جڑ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے کے تاریخی دشمن ہونے کا احساس نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور دونوں اپنے اپنے مذہب کو دوسرے کے مذہب کا بے حد مخالف پاتے ہیں۔ یہی تاثر تقسیمِ ہند کی بنیاد بنا جس سے بھارت اور پاکستان میں مستقل رقابت کی فضا قائم ہوئی اور بظاہر یہی سبب بھارت میں بار بار پھوٹ پڑنے والے ہندو مسلم فسادات کو جنم دیتا رہتا ہے اور جموں و کشمیر کے سیاسی مستقبل کے جھگڑے کی طوالت کی بنیاد بھی بنا ہوا ہے۔

میرے اس شعور نے (ہندوازم اور اسلام کے بارے میں نفرت بھرے اور اختصاصی فہم (exclusivist understandings) اور جموں وکشمیر کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے جاری کشمکش کے اسی فہم پر مبنی ہونے کے باعث) مجھے اس سخت ضرورت کا احساس دلایا کہ میں مذہب اور گروہی تشخص کے متبادل تصورات تلاش کروں تا کہ مذہبی اور گروہی 'مغائرت' کے لئے زیادہ قابل قبول، مثبت اور جامع تجاویز سامنے آ سکیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کام کو تنازعۂ کشمیر کے کسی بھی دیرپا حل میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح یہ بھارت اور پاکستان کے کشیدہ تعلقات اور بھارت کے اندر ہندو مسلم کشیدگی میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مکالمہ بین المذاہب اور مذہب کے سماجی ترقیاتی فہم کو آگے بڑھانے والے بڑے بڑے مذاہب خاص طور پر اسلام اور ہندوازم جو مذہبی تکثیریت کے بھی علمبردار ہیں کیونکہ وہ فرقہ وارانہ اختصاص، تعصب اور مذہب کے نام پر منافرت پھیلانے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اب وہ اس بات پر اپنے پختہ یقین کا اظہار کر رہے ہیں کہ کشمیر میں منصفانہ امن کے قیام کے لئے کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے اس امر پر حیرت، بلکہ صدمہ ہوا کہ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے کوشاں حکومتوں، بین الاقوامی تنظیموں، این جی اوز اور دیگر سول سوسائٹی گروپوں نے اس مقصد کو تقریباً مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے جسے کہ میں بے حد ضروری اور قطعی طور پر ناگزیر کام سمجھتا ہوں۔

1997ء میں جب کشمیر میں عسکریت پسندی اپنے عروج پر تھی مجھے ممبئی میں قائم "Centre for Study of Society & Secularism" نے ایوارڈ دیا، اس مرکز کے سربراہ ایک انتھک سکالر فعالیّت پسند اصغر علی انجینئر ہیں۔ مجھے جو کام سونپا گیا وہ یہ تھا کہ میں کشمیری تصوّف کی شاندار روایات پر تحقیق کر کے اس سے متعلقہ مواد مرتب کروں، بالخصوص ان میں موجود دینیاتی وسائل و منابع پر توجہ مرکوز کر کے انہیں بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لئے بروئے کار لاؤں، اختصاص (exclusivism) پر تنقید کروں اور مذہبی مغائرت سے نفرت کے رویّوں کو سامنے لاؤں۔ چنانچہ اس سال میں نے ساری گرمیاں وادیٔ کشمیر میں گزاریں جہاں میں خطّے کے متعدد صوفیوں کی درگاہوں میں جاتا رہا۔ نیم روشن لائبریریوں میں تصوّف کی کتابیں تلاش کرتا اور ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ میں نے کئی مزاروں کے متولّیوں

اور سجادہ نشینوں سے انٹرویو لئے اور اس موضوع پر کتابیں لکھنے والوں سے بھی تبادلہ خیال کیا۔ ان متولّیوں اور مصنفین میں کشمیری تصوّف کے کئی سلسلوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس کام میں صرف کئے ہوئے عرصے میں مجھ پر بہت سے اسرار منکشف ہوئے اور حیرت سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ اس سے مجھے ایسے اسلام سے آگاہی کے راستے مل گئے جو میرے ڈوڈہ کے ابتدائی دوروں میں معلوم ہونے والے اسلام سے بہت مختلف تھا۔ اُس زمانے میں میری ملاقاتیں رسم و رواج پر مبنی اسلام کے علمبردار وہابیوں اور سخت گیر لغوی اسلام پیش کرنے والوں سے ہوا کرتی تھیں اور اب مجھے سماج کی ان خادم ہستیوں سے میل ملاقات کا موقع ملا جو نسل در نسل رحم و شفقت کے مذہب کا درس دے رہے تھے۔ یہ ساری مخلوقِ خدا کو سماجی انصاف دلانے کے لئے ذات پات اور عقیدے کی تنگ حدود سے بلند تر ہو کر کام کرنے والے لوگ تھے۔ میں اس امر کا قائل ہو گیا کہ ان لوگوں کی عملی زندگی اور تعلیمات نہ صرف ہمارے لئے بیش قیمت ہیں بلکہ امن و آشتی کی تلاش کے ساتھ ساتھ تنازعۂ کشمیر کے منصفانہ حل کے لئے بھی مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان سے وہ مذہبی کارکن اور وطن پرست جنگجو بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں جو تنازعۂ کشمیر کے ذمہ دار ہیں اور خطّے میں خون ریزی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مگر شاید ان سے یہ توقع رکھنا بہت زیادہ تخیلاتی بات ہو گی۔ میں نے ان سے تھوڑا بہت اختلاف کرتے ہوئے اپنی تحقیق پر مبنی دو درجن سے کچھ زائد مضامین لکھے جو کشمیر، بھارت اور پاکستان کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ تنازعۂ کشمیر پر متوازن مکالمے کو فروغ دینے کے ئے میری بہت ہی عاجزانہ کوشش تھی۔ 1998ء میں ''سنٹر فار دی سٹڈی آف سوسائٹی اینڈ سیکولرازم'' نے میری تحقیق پر مبنی میرا ایک موضوعی رسالہ شائع کیا جس کا عنوان :

The Role of Kashmiri Sufis in the
Promotion of Communal Harmony and Social Reform

(''فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ اور اصلاحِ معاشرہ میں کشمیری صوفیوں کا کردار'')

تھا۔

چند برس بعد مجھے ایک اور ریسرچ فیلوشپ ملی، اس بار یہ دہلی میں قائم

(Wiscomp) کی طرف سے تھی۔ یہ ''فاؤنڈیشن فار یونیورسل ریسپانسبلٹی آف دی دلائی لامہ'' کا جزو تھی۔ اس کا مقصد عہدِ حاضر کے جموں وکشمیر میں مکالمہ بین المذاہب کے امکانات کا جائزہ لینا اور انہیں تنازعہ طے کرنے کا ذریعہ بنانا تھا۔

اس پروجیکٹ کے لئے میں نے تقریباً نصف سال ریاست بھر کے سفر میں گزارا۔ جس میں مجھے بیسیوں ہندوؤں، سکھوں، بودھوں اور مختلف پس منظر رکھنے والے دلتوں سے ملاقاتیں کر کے ان کے خیالات معلوم کرنے تھے۔ ان میں پادری، لامے، امام، مولوی، اور عام سطح کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ اس سے مجھے ان طریقوں کو جاننے اور سمجھنے میں مدد ملی جن سے مذاہب کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ ان کے خیالات اور کہانیوں سے یہ بات بالکل واضح ہو رہی تھی کہ ہر مذہب کی تشویشناک حد تک مختلف ومتنوع تعبیرات کی جا سکتی ہیں۔ بعض تعبیریں متشددانہ طور پر اختصاصی(exclusivist) اور فاتحانہ انداز لئے ہوتی ہیں اور دیگر مذاہب اور ان کے پیروکاروں کو یکسر مسترد کر دیتی ہیں جبکہ بعض مشمولہ(inclusive) ہو سکتی ہیں جو دیگر مذاہب اور ان کی پیروی کے دعویداروں کو آسانی سے قبول کر لیتی ہیں۔ ان کے بیانات کی روشنی میں مجھ پر مزید واضح ہو گیا کہ کشمیر کے مخصوص سیاق وسباق اور ایسی دیگر کشمکشوں میں جن میں مختلف مذہبی شناختوں اور فرقہ وارانہ وابستگیوں کے حامل عناصر ملوث ہوں، یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہر مذہب کی مؤخر الذکر بصیرتوں کو بروئے کار لایا جائے اور بھرپور طریقے سے انہیں فروغ دیا جائے۔ ساتھ ساتھ اس کے مخالفانہ مذہبی دلائل کی مذمت کی جائے جو اسی مذہب کے نام پر نفرت پھیلاتے ہیں۔ یہ تحقیق بعد ازاں ایک کتاب کی صورت میں شائع کی گئی جس کا ٹائیٹل "Religion, Peace and Dialogue in Jammu and Kashmir" تھا۔ دو سال بعد میں نے ایک اور پروجیکٹ کے لئے کئے گئے فیلڈ ورک کی بنیاد پر ایک کتابچہ شائع کیا جس کا ٹائیٹل "Kashmiri Muslim Perspectives on Inter-Faith Dialogue" تھا۔ اس پروجیکٹ کو بین الاقوامی این جی او"Oxfam" نے سپانسر کیا تھا۔ یہ کتابچہ کشمیری اماموں، صوفیوں اور اسلام کے ترقی پسندانہ فہم رکھنے والے اہل علم کے تفصیلی انٹرویوز کا مجموعہ تھا۔ اس فہم کی جڑیں دیگر مذاہب

MashalBooks.org